سرسید اور اکبر الٰہ آبادی پر ایک طائرانہ نظر

کلیدی الفاظ: تعلیم #تہذیب # لائحہ عمل # عقلیت# لبرل ازم # پرچم # علی گڑھ# برطانوی سامراج #

محمد عمران
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

Abstract : In the mid-19th century, two types of mindsets emerged. One was those who were supporters of Western civilization and culture and wanted to change with the times. On the other hand, there were people who were guardians of Eastern values and wanted to preserve Indian civilization and culture, facing the challenge of maintaining their identity and existence. The first ideology was promoted by Sir Syed and his followers, while the second ideology was led by Akbar Allahabadi.''

انیسویں صدی کے وسط کا زمانہ تھا۔ ہندوستان سیاسی اُتھل پتھل کا شکار ہو رہا تھا۔ سیاست میں طرح طرح کی تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور ہر طرف انقلاب کا پرچم بلند تھا۔ سب کے طریقہ کار اور لائحہ عمل مختلف تھے۔ عوام بے سروسامان تھی، کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔ انگریزوں کی زیادتیاں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ برطانوی سامراج اپنے عروج پر تھا۔ مشرقی لوگوں پر مغربی تعلیم و تہذیب کو تھوپا جا رہا تھا، مشرقی قدریں

اپنا دم توڑنے لگی تھیں۔ایسے دور میں دوطرح کے اذہان نے جنم لیا۔ایک وہ جو صرف مغربی تہذیب وتمدن کے حامی تھے اور تبدیلی زمانہ کے ساتھ بدلنا چاہتے تھے جن کا کہنا تھا کہ:

ع چلو ادھر کو جدھر کی ہوا ہو

اس نظریہ کو فروغ دینے والے سرسید اور ان کے متبعین تھے مگر دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے جو مشرقی اقدار کے پاسبان تھے اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کی بقا چاہتے تھے جنہیں اپنے وجود اور تشخص کو قائم رکھنے کا مسئلہ درپیش تھا۔اس نظریہ کو فروغ دینے والوں میں اکبر الہ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔

ایسے دور پر آشوب میں سرسید نے اپنی علمی وفکری بصیرت اور تدبر کے ذریعے قوم کو اس دلدل سے نکال کر ترقی کے مدارج طے کرانے کا بیڑا اٹھایا اور اپنی اَن تھک کوششوں سے قوم کی اصلاح اور فلاح کے لیے جہد مسلسل کرتے رہے۔اس وقت سرسید نے جس تدبر وتفکر سے کام لیا وہ بے نظیر ہے۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان حالات میں جب کہ انگریز حکومت مکمل طریقے سے اپنے پنجے گاڑ چکی ہے،احتجاجانہ رویہ اختیار کرنا بے سود ہے بلکہ ان سے معاندانہ لہجہ اختیار کرنے کے بجائے ان کا ساتھ دیا جائے اور قوم کو جدید علوم سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے تاکہ وہ خلیج جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوگئی ہے اس کی بھر پائی ہو سکے جس کے لئے مسلمانوں کی جدید تعلیم اور تہذیب سے آشنائی ضروری ہے۔

اسی لئے سرسید تحریک نے وقت کے تقاضے کے مدنظر ہندوستانی مسلمانوں کو قدیم دور سے جدید دور میں لاکر کھڑا کر دیا۔سرسید عقلیت اور لبرل ازم کے قائل تھے۔اسی لیے انہوں نے مذہب میں بھی عقلیت اور لبرل ازم کو داخل کرنے کی کوشش کی اور انہیں افکار کو قوم کے درمیان فروغ دینا شروع کیا۔اکبر الہ آبادی سرسید کے مذہبی لبرل ازم اور مغربی وضع وقطع پر شدت پسندی کے مخالف تھے۔وہ اسے مشرقی اقدار اور مذہبی روایات کے لئے مہلک مرض سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں سرسید کی مغربی تہذیب کو لے کر جا بجا تنقید کی ہے:

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سر سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجیے مجھ کو مسلماں کیجیے

نظر انکی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر
گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

اور تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشہ تقوی کو کردو پاش پاش

بار بار آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال
حضرت سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

رنگ چہرے کا تو کالج نے رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

دراصل اکبر الہ آبادی نئی تہذیب اور اس کے ہونے والے مضر اثرات پر نگاہ رکھتے تھے۔ وہ اپنی تہذیبی بقا کے ساتھ ساتھ ترقی کے متقاضی تھے۔ وہ حقیقت پسندی کے قائل تھے۔ مغربی سامراج کی ہو رہی اندھی تقلید اکبر کے لئے ایک پریشان کن مسئلہ تھا۔ اسی کے مدنظر مختلف اشعار میں انہوں نے اس کے ہونے والے مضر اثرات سے آگاہ کیا ہے۔ وہ ہندوستانی قوم جو انگریزی سیکھ کر صرف کلرکی کی طرف مائل تھی، جس کے سہارے وہ قعر مذلت کے غار عمیق میں دھکیلی جا رہی تھی، اکبر اس پر قدغن لگانا چاہتے تھے

۔اسی پر فضیل جعفری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اکبر کی شاعری کا حقیقی مقصد ایک ایسی قوم کو جو محض بابو گیری کے چکر میں بے غیرتی کا لبادہ اوڑھے جا رہی تھی غلاظت کے دلدل سے نکالنا تھا"

(فکر و تحقیق اکبر الہ آبادی نمبر صفحہ 42)

سر سید کی تحریک سے آرہی تبدیلیوں کو دیکھ کر اکبر میں بسنے والا انسان ایسی کشا کش میں مبتلا تھا جو پرانی اقدار کا پاسباں بھی تھا اور نئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا بھی چاہتا تھا۔ وہ اپنی قوم پر برطانوی سامراج کا تسلط بھی نہیں چاہتا ہے مگر بے بس ہے اس کے خلاف کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ اسی لئے جو اس کی خامیاں ہیں ان کا تمسخر کرتا ہے اور ظرافت کے پس پردہ طنز کرتا ہے۔ اکبر کی نظم ''قدیم و جدید کا جھگڑا'' اسی کی آئینہ دار ہے:

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید کہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ ادھر
زیادہ حد سے دیئے بس پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی، صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک
ادھر ہے وحیِ ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبت لیلیٰ، وفرقت لیلیٰ

اکبر نے اپنی شاعری میں سر سید کو جو نشانہ بنایا ہے وہ ان کی ذاتیات کو لے کر نہیں بلکہ ان کی علی گڑھ تحریک جس کے سماج پر غلط اثرات مرتب ہو رہے تھے، ان برے نتائج کو دیکھتے ہوئے ظرافت کا لبادہ اوڑھ کر تحریک کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ چونکہ علی گڑھ

تحریک ایک ایسی تحریک تھی جو قوم کی اور آل ڈیولیمنٹ ہمہ جہت ترقی چاہتی تھی اس لیے زندگی کے تمام شعبہ جات اس سے متاثر تھے چاہے وہ طریقۂ تعلیم ہو یا مذہبی عقائد و خیالات اور مشرقی اقدار۔ اس تحریک کے زیر اثر ان شعبہ جات میں بھی تبدیلیاں ہونے لگی تھی جن کے مضر اثرات کو وہ بخوبی محسوس کر رہے تھے۔

ایسا نہیں ہے کہ اکبر قدامت پرست یا تنگ نظر تھے یا وہ قوم کو فلاح و بہبود کے راستہ پر گامزن نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ وہ تو اس بات کے متقاضی تھے کہ مغربی روشنی کے چکاچوند میں قوم اپنی تہذیب میں ہی آگ نہ لگا دے اور اپنے تمدن کو پس پشت نہ ڈال دے۔ انھیں افکار کو لے کر اکبر نے سرسید کی تحریک کو نشانہ بنایا۔ اس کے لیے انہوں نے بلا واسطہ کے بجائے بالواسطہ راستہ اپنایا اور یہ واسطہ ان کی شاعری میں ظرافت کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

دراصل ان کے کلام میں صرف طنز ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے چھپا ہوا ایک کرب ہے، ایک کسک ہے۔ ان کی شاعری صرف لطائف تک محدود نہیں بلکہ اس کے پیچھے زوال پذیر ہو رہی تہذیب اور مسلمانوں کی بے عملی و بے بسی ہے اور اس بے بسی کا رنگ اس وقت کے ادیبوں کے یہاں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کا رونا روتے ہوئے اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں:

> "ہماری قوم اس قدر غافل اور مجہول ہو چکی ہے کہ اگر میں مسلمانوں کو دو روپے کی تمدنی یا مذہبی کتاب پڑھنے کو دوں اور اس کتاب کے مفید ہونے کا یقین بھی دلا دوں۔ تب بھی وہ پڑھنے پر تیار نہیں ہوگا اور یہی سبب ہے کہ میں اپنے کلام کو ظرافت کی چاشنی سے مرغوب تر بنا دیتا ہوں تا کہ لوگ ہنس کر متوجہ ہوں اور غور کریں"

(علی گڑھ میگزین اکبر الہ آبادی نمبر صفحہ 201)

دراصل اکبر الہ آبادی نے شعر و ادب کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا راستہ اختیار کیا۔ وہ ایک ماہر، نباض، زمانہ شناس اور ایک ماہر حکیم کی طرح قوم کے ذہنی مریضوں کو شاعری کی زبان میں کھری کھری سنانے کے بعد مرض کا علاج بھی بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ نقاد اکبر کو قدامت پرست کہتے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

قدامت پرستی نے انہیں مغربی علوم کے حصول اور سائنس وٹیکنالوجی اور کالج کی تعلیم کے خلاف کہنے پر اکسایا تھا۔ اکبر مطلقاً کالج کی تعلیم کے مخالف نہ تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ تعلیم ضرور حاصل کرو مگر اپنی حقیقت سے ضرور جڑے رہو:

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پر جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو

یہی نظریہ ان کا تعلیم نسواں کے تعلق سے ہے۔ تعلیم نسواں کے تعلق سے اکبر اس طرح سے اظہار خیال کرتے ہیں:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہے تو وہ بے شعور ہے

کلیات اکبر کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اکبر نے مختلف پیرائے میں سرسید اور علی گڑھ تحریک پر اپنی کشاکش کا اظہار خیال کیا ہے۔ سرسید تحریک کے مخالف سمجھے جانے والے اکبر الہ آبادی دراصل ان کی تحریک کے مخالف نہیں بلکہ اس کے نقاد تھے۔ وہ اس کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کر رہے تھے۔ اکبر کی یہ فکر تھی کہ سرسید نے جس مدرسے کی بنیاد رکھی ہے اس میں طالب علموں کی ایسی تربیت ہو جو ان کی دنیاوی تربیت کے ساتھ ساتھ اسلامی تربیت بھی کرے۔

تہذیب وہ ہے کہ رنگ مذہب بھی ہو
آزاد وہ ہے جو مؤدب بھی ہو

تزئین وہ ہے کہ خاکساری ہو ساتھ
اسپیچ وہ ہے کہ یارب بھی ہو

سرسیداور اکبر الہ آبادی کے خیالات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے خیالات میں ایسا کوئی فرق نہیں تھا جس کی وجہ سے اکبر کو سرسید کے مخالفین میں شمار کیا جائے مگر بعض ناقدین ادب نے ان کے اختلافات کو اتنی ہوا دی کہ ان کا شمار سرسید کے مخالفین میں ہونے لگا بلکہ انہیں ترقی کے مخالف بھی سمجھا جانے لگا۔ اسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر عطیہ رئیس لکھتی ہیں:

''مجھے تو اکبر کی تنقید کرنے والوں کی نیت پر شک ہوتا ہے۔ ان کے تنقیدی عمل سے تعصب کی بو آتی ہے انھیں کے زمانہ کے ایک بڑے نقاد کلیم الدین احمد تھے جن کی سخت تنقید سے سبھی خائف تھے انہوں نے اکبر کی شاعری کا معروضی مطالعہ کر کے جو فیصلہ صادر کیا ہے وہ زیادہ منطقی اور معقول نظر آتا ہے۔''

(ادب وثقافت)

کلیم الدین احمد نے اکبر کے متعلق جو منطقی اور معقول فیصلہ صادر کیا ہے وہ یہ ہے:

''وہ اکبر الہ آبادی ترقی کے خلاف نہ تھے۔ ترقی کی طرف قدم اٹھیں لیکن ذرا سوچ کر، نئی چیزیں اچھی ہیں پرانی چیز بری ہیں۔ یہی نقطہ نظر عام ہو چلا تھا وہ اس بے عقلی کے خلاف تھے۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر صفحہ-63 62)

اکبر اور سرسید کے درمیان کا اہم فرق یہ تھا کہ سرسید تحریک مذہبی معاملات میں سائنس کو تھوپنے کی کوشش کر رہی تھی اور مذہبی عقائد کو جو عقلیت پر پرکھا جا رہا تھا اکبر اس کے مخالف تھے۔ ایک ایسا گٹھ بندھن جو سرسید مذہب اور سائنس کے درمیان کرنا چاہتے تھے یہ اکبر کو پسند نہ تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید سے اکبر کا اختلاف کلی نہیں جزوی تھا، فروعی نہیں اصولی تھا۔ باوجود اس کے اکبر سرسید کے حکیمانہ نکتہ نظر کے معترف

تھے ۔ان کے خلوص ،جذبہ، جوش ،اصلاحی لگن، ہمت اور استقلال کے بڑے قدردان تھے ۔صرف قدردان ہی نہیں بلکہ ان کی عظمت کے قائل تھے ۔بقول شمس الرحمٰن فاروقی ؛

"اکبر کو اپنے طور پر سرسید سے محبت تھی ۔سرسید کے
خلوص نیت ،خلوص عمل ،مشقت برائے قوم ،تعلیم اور
خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے مقصود سے
ان کے دلی لگاؤ کی وہ قدر کرتے تھے"

(جدید کل اور آج صفحہ 168)

اکبر الہ آبادی نے سرسید کی کارگزاری کی تعریف بھی کی ہے اور ان کے قوم سے عشق کو سراہا بھی ہے جس کا اظہار ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

واہ رے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوز جگر کیا کہنا
ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے
نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

☆☆☆